Fikr-o-Nasar (Islamabad) 12:10-11 (1975)

عہدِ جدید کے مسائل اور آنحضرتؐ کا پیغام

شرف الدین اصلاحی

اس میں شک نہیں کہ آج کی دُنیا مسائل کی دُنیا ہے، چھوٹے بڑے گوناگوں مسائل، اُلجھے ہوئے پیچیدہ اور سنگین مسائل، سیاسی اور اخلاقی مسائل، معاشی اور معاشرتی مسائل، انفرادی اور اجتماعی مسائل، داخلی اور خارجی مسائل، قومی اور بین الاقوامی مسائل، القصّہ مسائل ہی مسائل۔ یہ بھی درست ہے کہ پچھلے ادوار کے مقابلے میں اس دَور کے مسائل اور ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں زندگی سادہ اور محدود تھی اس لئے مسائل بھی کم اور سیدھے سادے تھے۔ تہذیب و تمدّن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ زندگی جُوں جُوں پیچیدہ ہوتی گئی مسائل بھی بڑھتے گئے اور ان کی ژولیدگی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن فی نفسہٖ مسائل کا ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ مسائل ہمیشہ سے ہیں۔ مسائل اس وقت بھی تھے جب یہ زمین پہلے پہل انسان کا مسکن بنی۔ مسائل اس وقت بھی تھے جب انسان نے تہذیب و تمدّن کی بنیاد رکھ کر اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔ مسائل کل بھی تھے۔ مسائل آج بھی ہیں۔ اور مسائل آئندہ بھی رہیں گے۔ مسائل زندگی کے ساتھ ہیں۔ انسان اور مسائل لازم و ملزوم ہیں ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اس دَور کے مسائل کیا ہیں؟ اس کا جواب ہر وہ شخص بآسانی دے سکتا ہے جو آج کی دُنیا میں رہتا ہے اور حالاتِ حاضرہ کی تھوڑی بہت خبر رکھتا ہے۔ مسائل کا شمار ہمارا مقصود نہیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ مسائل ہیں یا نہیں۔ یہ سوال بھی نہیں کہ مسائل کیا ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے۔ حل ہے بھی یا نہیں۔ اگر حل ہے تو مسائل حل کیوں نہیں ہوتے۔ گتھیاں سُلجھنے کی بجائے اور اُلجھتی کیوں جاتی ہیں۔ مسائل کی تعداد میں کمی کی بجائے روز بروز اضافہ کیوں ہوتا جاتا ہے۔ امن و سکون سُکھ اور شانتی اس جہانِ گزراں میں انسان کی تمام تر سعی و جستجو کا منتہائے مقصود ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ سعی و تلاش کی راہ میں اُٹھنے والا ہر قدم اسے منزل سے

دوڑے جارہا ہے۔

مسائل کی مثال ان بیماریوں کی سی ہے جو انسانی جسم کو لاحق ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے بیماری کوئی آرزو کرنے کی چیز نہیں۔ بیماری چھوٹی ہو یا بڑی، بیمار امیر ہو یا غریب، بچہ ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت، پہلی فرصت میں فکر یہی ہوتی ہے کہ بیماری کا ازالہ کیا جائے۔ اور انسان اپنا سب کچھ قربان کرکے کھوئی ہوئی صحت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن تمام تر فکر اور کوشش کے باوجود اگر مرض ٹھیک نہ ہو بلکہ اُلٹا بڑھتا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ علاج صحیح نہیں ہو رہا۔ مختلف دواؤں اور مختلف معالجوں کو بدل بدل کر آزمانے اور تجربہ کرنے کے بعد بھی اگر مرض میں افاقہ کی بجائے اضافہ ہوتا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ خود علاج میں کوئی خرابی ہے۔

بیماری کے علاج میں چند باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسے طبیبِ حاذق کی طرف رجوع کیا جائے جو صحیح طریقِ علاج سے واقف ہو اور اپنے فن کا ماہر ہو۔ طبیب اس نکتے سے واقف ہو کہ مرض کا سبب معلوم کئے بغیر کوئی علاج کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد مریض کے مزاج اور موسم کی کیفیت کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔ غرض مرض کی صحیح تشخیص اور صحیح دوا کی تجویز پر ہی صحت کی بازیابی کا مدار ہے۔ وہ معالج جو اس فطری طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا وہ مرض کو اور اُلجھائے گا۔ اپنی بے تدبیریوں سے معمولی سی شکایت کو پیچیدہ اور مزمن امراض میں تبدیل کردے گا۔ اُلٹی سیدھی دوائیں دے کر نئی بیماریاں پیدا کردے گا۔ ایسے طبیب کے ہاتھوں مریض کی جان خطرے میں پڑ جائے تو بھی جائے تعجب نہیں۔ اس کے برعکس اگر تشخیص و تجویز صحیح ہو تو خطرناک سے خطرناک بیماری بھی بسا اوقات معمولی دواؤں سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اور دوا صحیح ہو تو اس کا اثر فوری ہوتا ہے اور صحت یابی کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہوتی ہے۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر عہدِ جدید کے مسائل اور ان کی تاریخ کا بے لاگ تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" کا مضمون ہے۔ یہ صورتِ حال اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ مسائل کو حل کرنے کی جتنی بھی کوششیں اب تک کی گئی ہیں یا کی جا رہی ہیں ان میں ضرور کوئی بنیادی خرابی موجود ہے۔

مسائل کے حل میں ساری بات صحیح سمت میں قدم اُٹھانے کی ہے۔ مکّہ کا مسافر اگر ترکستان کی

شاہ راہ پر چل پڑے تو منزل کی سچی لگن اور طلبِ صادق کے باوجود وہ ہر گام منزل سے دُور ہوتا جائے گا۔ منزل سے ہمکنار ہونا ایسے مسافر کا مقسوم نہیں ہوتا۔ منزل انہیں ملتی ہے جو ارادے کے بعد منزل کی سمت سفر بھی کرتے ہیں اور راہِ راست ان کے ہم رکاب ہوتی ہے۔ عہدِ جدید کا انسان اپنے نت نئے مسائل کے حل کا دل سے خواہاں ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ جو تدبیریں کرتا ہے وہ اس لئے اُلٹی ثابت ہوتی ہیں کہ منزل کے تعیّن کے باوجود وہ صحیح راستہ اختیار کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مقصد کا اسے شعور ہے لیکن ذریعے کی تلاش میں وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ اس لئے اسے ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

فرض کیجئے ہمیں ریشمی دھاگے کا اُلجھا ہوا ایک لچھا سُلجھانے کو دیا جائے۔ اگر ہم نے شروع ہی سے اس کا سرا پا لیا تو بڑی سے بڑی گتھی کے سُلجھانے میں بھی چند لمحوں سے زیادہ نہیں صرف ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم نے سرا ہاتھ میں لئے بغیر ہی اسے سُلجھانے کی کوشش کی تو اس کوشش کا انجام کیا ہوگا۔ بہ ہزار دِقّت اگر ہم ایک گرہ کھولنے میں کامیاب ہوں گے تو اس میں سو گرہیں اَور پڑ جائیں گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تھوڑی دیر بعد اس میں گرہیں ہی گرہیں نظر آئیں گی۔ آج اِنسانیت کو درپیش مسائل اور ان کے حل کی کوششوں کا یہی حال ہے۔ آج کے اِنسان کا حال ریشم کے اُس کیڑے کا سا ہے جو ریشم کے تار اپنے گرد لپیٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے تہہ بہ تہہ پھندے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اور یہ حالت اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس ضمن میں اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر کے صحیح طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا۔ اسے سب سے پہلے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مسائل پیدا کیوں ہوئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دریافت میں وہ اپنی ناقص عقل اور خطا کار بصیرت پر اعتماد کرتا ہے اس لئے اصل اسباب کی دریافت سے قاصر رہتا ہے اور رشتۂ کار کا سرا اس کے ہاتھ نہیں آتا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں انسانیّت کے گم کردہ راہ قافلے کی رہنمائی کے لئے اس دُنیا میں اگر امید کی کوئی کرن ہے تو وہ آنحضور صلعم کا پیغام ہے۔ آنحضرت صلعم کا پیغام نہ صرف یہ کہ مرض کے سبب کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ علاج کے فطری طریقے بھی تجویز کرتا ہے۔ ضرورت اس کے علم اور اس پر عمل کی ہے۔ آنحضرت صلعم نے بتایا کہ ساری خرابی کی جڑ پیغامِ حق سے اِنسان کی

روگردانی ہے۔ اور حق کا پیغام ہی دراصل آنحضرتؐ کا پیغام ہے۔ آپؐ نے اپنے پیغام میں سبب کی نشاندہی کے ساتھ فرداً فرداً مسائل کے حل بھی بتا دیئے ہیں۔

آنحضرت صلعم کا پیغام اللہ کا فرمان اور آپؐ کی سیرت عمل بالقرآن ہے۔ قرآن مجید اور آپؐ کی سیرت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رہنمائی کے لئے جو کچھ فرمایا ہے آنحضورؐ کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب آپؐ کی سیرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا وکان خلقہ القرآن آپؐ کی سیرت قرآن ہے۔ قرآن ایک حرف کی کمی بیشی کے بغیر آج کے انسان کے پاس موجود ہے۔ آپؐ کی سیرت کو آپؐ کے پاک اصحاب نے جس اہتمام کے ساتھ جمع کر کے محفوظ کر دیا ہے وہ بھی تاریخِ انسانی کا ایک فقید المثال واقعہ ہے۔ یوں تو آپؐ کے پیغام کا ایک ایک لفظ اپنی افادیت کے لحاظ سے اہم اور قابلِ توجّہ ہے لیکن اس میں تین باتیں خاص اور بنیادی ہیں۔ آج کا انسان اگر صحیح معنوں میں ان کو اپنائے تو اس کے جملہ مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے:

۱۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ آخرت۔

یعنی معبودِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو حاکم علی الاطلاق تسلیم کر کے اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کی جائے، سلسلۂ نبوت کو حیاتِ دنیوی میں واحد ذریعۂ ہدایت مان کر زمامِ کار کلیتہً اس کے ہاتھ میں دے دی جائے، روزِ جزا کی جوابدہی کا احساس اپنے دل میں ہر لحظہ تازہ رکھا جائے۔ انسانی زندگی سے ان باتوں کا اُٹھ جانا ہی عہدِ جدید کے مسائل کا باعث ہے۔ اس لئے یہ مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان باتوں کو ان کے جملہ تقاضوں سمیت اختیار نہیں کر لیا جاتا۔

آنحضرت صلعم کا پیغام اس حقیقت کی طرف توجّہ دلاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قانونِ فطرت یعنی حکمِ الٰہی کی پابند ہے۔ وکل لہ قانتون ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ یہ قرآن کا فرمان ہی نہیں ہے بلکہ ہمارا آپ کا مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا کافر، مشرک، ملحد زندیق، دہریہ اور کمیونسٹ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ قدرت کا کارخانہ کچھ بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق چل رہا ہے اور اسی لئے اس میں کبھی خلل نہیں واقع ہوتا۔ آفاق و انفس کی بے شمار کھلی ہوئی آیات اس کی روشن دلیلیں ہیں۔ انسان اس وسیع و عریض کائنات

کا ایک ادنیٰ اور حقیر سا حصّہ ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مسائل کا بکھیڑا صرف اسی کی جان کے ساتھ ہے۔ رخنے صرف اسی کی زندگی میں کیوں ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ اِنسان اپنے لئے مسائل خود پیدا کرتا ہے۔ یہ اس کی اپنی کج اندیشیاں اور غلط کاریاں ہیں جو اس کے مسائل کی ذمّہ دار ہیں۔ اس کائنات میں اِنسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو آزادی و خود مختاری کی نعمت سے بہرہ ور ہے۔ اور یہ آزادی و خود مختاری ہی اس کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ کائنات کی کوئی شئے قدرت کے ٹھہرائے ہوئے اصولوں سے سرِمُو انحراف نہیں کر سکتی۔ مگر اِنسان کو یہ حق و اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان اصولوں کی پابندی کرے اور چاہے تو خلاف ورزی کرے۔ جہاں تک وہ اسلوبِ فطرت کی پابندی کرتا ہے اس کی زندگی ہموار اور استوار رہتی ہے، جہاں وہ انحراف کرتا ہے اس کی زندگی کے نظام میں خلل پیدا ہوتا ہے اور اس خلل سے نت نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔ اِنسان کے لئے پسندیدہ راستہ یہی ہے کہ دوسری مخلوقات کی طرح اپنے فکر و عمل میں فطرت کے تقاضوں کا پابند رہے۔ لیکن اس کی افتادِ طبع جسے دوسرے الفاظ میں بشری کمزوری کہنا چاہیئے اس کو فطرت کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور وہ ان حدود سے تجاوز کر جاتا ہے جن کی پابندی کئے بغیر وہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتا۔ اور نتیجتہً اُلجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے اور طرح طرح کے مسائل سے دو چار ہوتا ہے۔ آنحضرت صلعم نے آکر اِنسان کو فطرت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اس کو بتایا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ دُنیا میں امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کے لئے اس کو کس طرح رہنا چاہیئے۔

اس ضمن میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِنسان ہدایتِ آسمانی سے بے نیاز ہو کر اپنے مسائل حل کر سکتا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مسائل پیدا ہی آسمانی ہدایت سے بے نیازی کے سبب ہوتے ہیں تو آسمانی ہدایت کے بغیر ان کو حل کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ مسائل کا حل آسمانی ہدایت کی پیروی میں ہی مضمر ہے اور آسمانی ہدایت کا آخری صحیفہ آنحضرت صلعم کا پیغام قرآن ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ عہدِ جدید کے مسائل صرف قرآن حل کر سکتا ہے۔ اِنسان کی علمی فتوحات اور عقلی ترقیات کے سامنے مہر و ماہ کی بلندیاں سرنگوں ہیں۔ پھر بھی زندگی کے بنیادی مسائل کے حل کے لئے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ہدایتِ ربّانی کا محتاج ہے۔

آج کا انسان بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دُنیا کا خالق وہ ہے۔ جب وہ دُنیا کا خالق نہیں تو اس کے نظام کو چلانے کے لئے قاعدے اور قانون بنانے کا اہل وہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ دُنیا کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اس لئے اس کی حکمرانی کا حق بھی اس کو پہنچتا ہے لہ الخلق ولہ الامر۔ تخلیق اسی کی ہے اس لئے حکم بھی اسی کا ہوگا۔ انسان خدا کا نائب ہے اور نائب ہی رہے گا۔ نائب کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ اصل مالک کے حکم کو نافذ کرے نہ کہ اپنا حکم چلائے۔ انسان ہَوا و ہوس کا بندہ ہے، اس سے یہ ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ منصب حکمرانی پر فائز ہو کر بے لاگ عدل و انصاف کے ساتھ دنیا کا کاروبار چلائے گا۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے یہ پیغام دیا کہ تمام بنی نوعِ انسان اس بالاتر ہستی کے مطیع و فرمانبردار ہو جائیں جو ایک ہے پاک ہے بے نیاز ہے، خالق ہے مالک ہے۔ علیم ہے خبیر ہے، حکیم ہے عادل ہے۔ کہ اس کی اطاعت ہی میں ان کے مسائل کا حل ہے۔

آج کے انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دَور میں رہتا ہے جو افکار کے تصادم نظریات کی جنگ کی وجہ سے ابتری اور پراگندگی کا شکار ہے۔ یہ ازم وہ ازم، باطل رنگ بدل بدل کر انسانی فکر و نظر پر یلغار کرتا ہے اور حق اپنے علمبرداروں کی بے حسی کا ماتم کرتا ہے۔ عام انسان ایک افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر۔ وہ سرگشتہ و حیران ہے کہ کدھر جائے۔ کبھی اس کو آزماتا ہے کبھی اس کو۔ کبھی اس کو اپناتا ہے کبھی اس کو۔ ایک ازم کو آزماتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اس سے مسائل حل نہیں ہوتے تو اس کو چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے ازم کی طرف لپکتا ہے مگر وہاں بھی اس کو مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ تجربات کے اس چکر سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ وہ ایسے "ازم" کو نہیں اپناتا جو اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ اور وہ ازم دینِ فطرت اسلام ہے جو نبی عربی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا۔

عہدِ جدید کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ... بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ عہدِ جدید کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ خود یہ سوال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام یعنی دینِ اسلام عہدِ جدید کے مسائل حل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اغیار اور دشمنانِ اسلام کا ذکر چھوڑیئے خود ہم مسلمانوں میں

ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اسلام قصّۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ یہ چودہ سو سال پرانا نظام یا نظریہ نئے دَور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اسلام اس دَور کے لئے تھا جب انسانی تمدّن ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا۔ عہدِ حاضر کی پیچیدہ زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ نئے دَور کے نئے مسائل کے لئے نئے نظام کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت وہ عصرِ حاضر کے نت نئے ازموں (ISMS) سے پوری کرنی چاہتے ہیں۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو خدا کی ہستی پر یقین نہیں رکھتا نہ ہی رسالت کی حقیقت سے واقف ہے اور نہ ہی روزِ جزا کا قائل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ان بے دین دہریوں اور ملحدوں کا گروہ ہے جو سرے سے آسمانی ہدایت کی ضرورت ہی پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ لوگ آج کیا چودہ سو سال پہلے بھی اسلام کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ انہی میں منافقوں کا وہ گروہ بھی شامل ہے جو اوّل الذکر کے سے ہی خیالات رکھتا ہے لیکن معاشی اور معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے اسلام کا نام لینا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دینِ اسلام کو عام مذاہب کی طرح ایک مذہب ہی سمجھتے ہیں۔ وہ دُنیا اور دُنیا کے امور و مسائل کو مذہب کے دائرے سے خارج تصوّر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب چند رسمی عبادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ جاہلوں کا گروہ ہے جن کی دینی معلومات چند سُنی سُنائی باتوں تک محدود ہے۔ وہ اسلام کی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ انہیں آنحضرت صلعم کی بعثت کی غرض و غایت کی بھی خبر نہیں اس لئے گمراہ کن خیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ان سب کو ہمارا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ وہ تعصّب و تنگ نظری کو خیرباد کہیں، نیک نیتی سے حق کی جستجو کریں اور چاہِ جہالت سے نکل کر علم کی دُنیا میں قدم رکھیں، پھر دیکھیں کہ اسلام کس طرح آج کے مسائل حل کرتا ہے! اسلام کا مقابلہ دُنیا کے کسی نظام یا ازم سے کرنا اسلام کی توہین ہے۔ مقابلے اور موازنے کے لئے جو شرائط ہیں وہ یہاں پوری طرح پائی ہی نہیں جاتیں۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظامِ حیات ہے جب کہ دوسرے نظام ہائے زندگی انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ انسانی ذہن جو ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہتا ہے، خطا اور نسیان جس کی صفت، نقص اور کوتاہ رسی جس کی خاصیت ہے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے نظام

یا ازم جنہیں عہدِ جدید کے مسائل کے حل کا دعویٰ ہے ناقص اور نامکمل ہیں، ان کا دائرۂ عمل زندگی کے کسی ایک شعبے یا چند شعبوں تک محدود ہے۔ اس کے برعکس اسلام مکمل نظامِ زندگی اور جامع دستورِ حیات ہے، انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ وہ انسانی زندگی کو ایک اکائی سمجھتا ہے جب کہ دوسرے نظام اس کی تقسیم کے قائل ہیں اور یہیں سے ان کی کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے نظام افراط و تفریط میں مبتلا ہیں جب کہ اسلام ہر مسئلے میں اعتدال اور توازن کی راہ پسند کرتا ہے خیرالامور اوسطہا اس کا اصل الاصول ہے۔ وہ اپنے اوامر و نواہی قواعد اور قوانین میں انسانی فطرت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیہا۔

رہے دوسرے آسمانی مذاہب سو ان کو مقابلے پر لانے کا سوال اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ ان کی صحیح اور سچی باتوں کو اسلام خود تسلیم کرتا ہے اور وہ سب کی سب اسلام میں زیادہ صحت و کمال کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی اصلی تعلیمات اور اسلام کی تعلیمات میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں۔ اسلام کوئی نیا دین ہونے کا مدعی نہیں وہ ان تمام مذاہب آسمانی کا جامع اور ناسخ ہے جن کا سلسلہ پیغمبرِ اوّل حضرت آدم علیہ السّلام سے شروع ہوتا ہے۔ نبی آخرالزماں جو دین لے کر آئے وہ ہر لحاظ سے جامع اور مکمل تھا اس لئے نہ اگلے مذاہب کو باقی رکھنے کی ضرورت رہی، نہ ہی یہ ضرورت رہی کہ آئندہ کوئی اور دین آئے۔ آنحضرت صلعم جو پیغام لائے اب وہ رہتی دنیا تک اہلِ زمین کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ زندگی کتنی ہی کروٹیں بدلے، زمانہ اپنے اوپر کتنے ہی رنگ چڑھائے، تہذیب و تمدّن کا کارواں کتنی ہی منزلیں آگے بڑھ جائے، انسان علم و اکتشاف سائنس اور ٹکنالوجی کے کتنے ہی معرکے سر کرلے، اسلام کی قندیلِ رحمانی انسانیت کو اس کے سفرِ ارتقا میں راستہ دکھاتی رہے گی، اور اس کی روشنی میں انسان اسی طرح اپنے مسائل حل کرتا رہے گا جس طرح کہ چودہ سو سال پہلے کیا تھا۔ اسلام کسی انسان کا ایجاد کیا ہوا فیشن تو نہیں جو کچھ دنوں بعد پرانا ہو کر بے کار ہو جاتا ہے۔ وہ ایک حکیم و خبیر خدائے لم یزل و لایزال کا مرتّب کردہ آخری جامع اور مکمل دستورِ حیات ہے جس کا مقصد ہی بندوں کی ہدایت و رہنمائی ہے۔ اگر وہ انسانی مسائل حل نہیں کرے گا تو کیا عہدِ جدید کے وہ ازم حل کریں گے جو چند بر خود غلط گم کردہ راہ انسانوں کی خود غرضانہ خواہشات یا ردِّ عمل کے منفی رجحانات کا نتیجہ ہیں۔

اب ہمیں مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ عہدِ جدید کے وہ خاص خاص مسائل کیا ہیں جنہیں حل کرنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے! اسلام ان مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے اور آج کے نام نہاد "ازم" ان کو کس طرح حل کرنا چاہتے ہیں۔ آج انسانیت کو جن سنگین مسائل کا سامنا ہے ان میں ایک بڑا مسئلہ خود اس کی بقا اور سلامتی کا ہے۔ اس وقت پوری انسانیت آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ دنیا کا گوشہ گوشہ شر و فساد سے بھر چکا ہے۔ قریب ہے کہ انسان اپنی ہی جلائی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے۔ ہلاکت اور تباہی کے مہیب تاریک سائے ہر سُو بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ وسائلِ حیات کا بڑا حصّہ جو انسان کے لئے بہتر زندگی کا سامان فراہم کرنے کی ضمانت ہونا وہ آج دُنیا کو جہنم میں تبدیل کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بظاہر امن کی باتیں کرنے والے بباطن جنگ اور کُشت و خُون کے نقیب ہیں۔ اِنسان اِنسان کا دشمن ہے۔ نفرت حقارت تعصّب اور تنگ نظری نے اِنسانیت کی ردا کو تار تار کر دیا ہے۔ دُنیا جسے اخوّت محبّت اور بھائی چارے اور باہمی ہمدردی کا چمنِ زار ہونا چاہیئے تھا وہ آج بُغض و عناد ظلم و ناانصافی بے رحمی اور برادر کُشی کا گہوارہ بن چکی ہے۔ اِنسان جسے زندگی سے پیار ہونا چاہیئے تھا وہ زندگی سے بیزار خود زندگی کا گلا گھونٹنے کے درپے ہے۔ یہ صورتِ حال سب کے لئے پریشان کُن ہے! افراد ہوں یا اقوام، چھوٹی ریاستیں ہوں یا بڑے ممالک، اِس برّاعظم کے رہنے والے ہوں یا اُس برّاعظم کے، ان کا تعلق ایک بلاک سے ہو یا دوسرے بلاک سے۔ یہ ایک عالمی اور ہمہ گیر مسئلہ ہے۔ اس وقت پوری انسانیت معرضِ خطر میں ہے۔ اِنسان نے تہذیب و تمدّن اور اسبابِ زیست کی ترقّی کے ساتھ خوشگوار زندگی کے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ اس کی کوشش کے جو ہولناک نتائج سامنے ہیں وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ معلوم نہ تھا کہ اٹوپیا کی جستجو میں وہ جہنم کے دروازے پر پہنچ جائے گا۔ وہ ماحول کی پُر ہول تاریکی سے نکل کر روشنی کی طرف آنا چاہتا ہے مگر اس کی کوشش اس لئے کارگر نہیں ہوتی کہ رشتۂ کار کا وہ سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے جس کے بغیر تدبیر اُلٹے نتائج پیدا کرتی ہے۔ اس کی کوشش کی مثال دلدل میں پھنسے ہوئے اُس آدمی کی ہے جو محض اپنی طاقت کے بل پر باہر آنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے آدمی کا انجام ہلاکت ہے۔ اس حالت سے نکلنے کا

صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ہی جیسے انسان کی غلامی ترک کرکے معبودِ حقیقی کی بندگی قبول کرے، کہ یہی سلامتی کا واحد راستہ ہے، باقی جتنے راستے ہیں ان میں ہلاکت ہے خرابی ہے تباہی ہے بربادی ہے۔ پکارنے والا آج بھی پکار رہا ہے یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ اسلام کا راستہ اطاعت اور اس کی منزل سلامتی ہے۔ عہدِ جدید کے اس بنیادی مسئلے کے حل کے لئے آنحضرت صلعم کا پیغام ہے ادخلوا فی السلم کافۃ سب کے سب پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اس آواز پر لبیک کہنے کی دیر ہے یہی دُنیا جو آج جہنم کا نمونہ بنتی جا رہی ہے چلا ہی رشکِ ارم بن جائے گی۔

عہدِ جدید کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ نسل، رنگ، زبان اور وطن کے امتیازات کا ہے۔ جن کی بنیاد پر خلقِ خدا اقوام میں بٹ کر باہم برسرِ پیکار ہوتی ہے۔ اسلام ان امتیازات کو مٹا کر تمام بنی نوعِ انسان کو ایک وحدت کی لڑی میں پروتا ہے۔ اور ان تمام دیواروں کو گرا دینا چاہتا ہے جو انسان اور انسان کے درمیان تفریق و تقسیم کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہیں۔ یہاں نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ گورے کو کالے پر۔ اس کے نزدیک معیارِ فضیلت اگر کوئی چیز ہے تو دین و تقویٰ شرافت اور اخلاق ہے۔ انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اسلام صلہ رحمی کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ قطعِ تعلق کی۔ وہ کہتا ہے کہ انسان سب کے سب ایک خدا کی مخلوق اور ایک آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔ اس لئے بعض فطری امتیازات کی بنیاد پر تفریق و تقسیم کی مصنوعی حد بندیاں قائم کرکے اپنے گرد گروہی اور جماعتی مفاد پرستی کا حصار کھینچنا فساد فی الارض کے مترادف ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ واللہ لا یحب الفساد۔

موجودہ دور میں سیاسی کش مکش کی جتنی صورتیں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب دین سے دُوری کا نتیجہ ہیں۔ اس دور کی سیاسی کش مکش نے انسانی زندگی پر جو بُرے اثرات ڈالے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آج ممالک اور اقوام ہی نہیں قبائل اور خاندانوں سے گزر کر گھر گھر اس کے تباہ کن اثرات پھیل چکے ہیں۔ اسلام میں سیاست کا مفہوم کچھ اور ہے اور عہدِ حاضر کے

مادہ پرستانہ نظریات کے زیرِ اثر فروغ پانے والے تصوّراتِ سیاست کچھ اَور ہیں۔ اسلام میں سیاست کی بنیاد خدمتِ خلق، ایثار اور انسانیت کی بھلائی پر ہے۔ جبکہ دوسرے نظام عیّاری مکّاری، خود غرضی، مفاد پرستی اور استحصال کو سیاست کا نام دیتے ہیں۔ دُنیا میں جب تک اسلامی تصوّرِ سیاست کی کارفرمائی رہی دنیا نے عفو و درگذر فلاح و بہبودِ عامہ کے وہ مناظر دیکھے کہ شاید و باید۔ جب سے دُنیا میں غیر اسلامی تصوّرِ سیاست کو فروغ ہُوا ہے باہمی منافرت جوشِ انتقام، لُوٹ کھسوٹ کا دَور دورہ ہے۔ دِین سے جُدا ہو کر سیاست نے چنگیزی کی صورت اختیار کر لی ہے جس کی تباہ کاریاں دیکھ کر دُنیا پناہ مانگتی ہے۔ آنحضور صلعم نے جو دستورِ حیات اور نظامِ زندگی ہمیں دیا ہے اس میں انسانی زندگی کا کوئی جُز اپنے کُل سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اور اس نظام میں سیاست چونکہ دین کے تابع رہتی ہے اس لئے بے راہ روی کا شکار نہیں ہونے پاتی۔ اسلام میں سیاست بھی اسی طرح اصلاح اور اشاعتِ خیر کا ذریعہ ہے جس طرح کہ عبادات و اخلاق۔ آنحضرت صلعم نے جس قسم کی سیاست کو رواج دیا اس کے زیرِ اثر قائم ہونے والی ریاست میں بلا امتیاز و تفریق مُسلم اور غیر مُسلم سب کے لئے امن اور سلامتی کی ضمانت ہے۔

کردار کی پستی اور اخلاقی گراوٹ بذاتِ خود عہدِ جدید کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے جو دوسرے معاشرتی معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ان مسائل نے زندگی میں جو اُلجھنیں پیدا کی ہیں ان کا ذکر یہاں اس لئے غیر ضروری ہے کہ ان سے ہر کہہ و مہ واقف ہے۔ اخلاق انسانیت کا زیور اور سماج کی زینت ہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت جسدِ زندگی میں قلب کی ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور اگر وہ ٹھیک رہے تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ دُنیا کے دساتیرِ حیات میں اخلاقی تعلیم و تربیت کا کوئی باب نہیں۔ اور اگر اس نام کی کوئی چیز کہیں ہے تو اس کا مسمّیٰ کچھ اور ہے۔ ان کا اخلاق اغراض و مصالح کے تابع ہوتا ہے۔ مجرد اخلاق کا ان کے ہاں کوئی تصوّر نہیں۔ اخلاق کو ایک مقصود بالذات کی حیثیت سے کسی دنیوی نظام نے اپنے اندر جگہ نہیں دی۔ یہ صرف آسمانی مذہب ہیں جس کی تکمیلی شکل آنحضرت صلعم کا پیغام دینِ اسلام ہے۔ ایک مستقل حیثیت سے موجود ہے۔ قرآنِ مجید کا ایک حصّہ اخلاقِ عالیہ کے ذکر و بیان پر مشتمل ہے۔ آنحضرت صلعم نے ایک حدیث

میں اخلاقِ عالیہ کی تکمیل کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے آپؐ نے فرمایا بعثت لا تمم مکارم الاخلاق میں اچھے اخلاق انسانی کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ اسلام حسنِ اخلاق اور حسنِ سیرت کو زندگی کی اساس قرار دیتا ہے۔ جس نظام کی بنیاد ہی اخلاقی قدروں پہ ہو اس کے مطابق قائم ہونے والا معاشرہ بنی نوعِ انسان کے لئے رحمت ہی ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسرے مسائل کی طرح اس دور کے معاشی مسائل بھی بے خدا نظریۂ حیات، بے دین تصوّر سیاست اور مادہ پرستانہ نظامِ معیشت کے زادہ و پروردہ ہیں۔ اس وقت دو معاشی نظام ہیں جنہوں نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ کہنے کو یہ اس دور کے معاشی نظریئے ہیں لیکن حقیقت میں یہ معاشی چکر ہیں جنہوں نے مل کر خلقِ خدا کو مبتلائے رنج و محن کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ وہ انسان کے معاشی مسئلے کا حل ہے لیکن حقیقت میں وہ خود مسئلے ہیں جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کے دوسرے مسائل کی طرح معاش کے مسئلے کا حل بھی اسلام ہی ہے۔ اسلام معاش و معاد کے امتزاج اور دین و دنیا کی ترکیب سے ایک ایسا متوازن صالح اور پاکیزہ نظامِ معاشرت قائم کرتا ہے جس میں نہ سرمایہ داری فروغ پا سکتی ہے نہ اشتراکیت پروان چڑھ سکتی ہے۔

اسلام میں سرمایہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اسلام کے اقتصادی اصول سرمایہ داری کو پنپنے نہیں دیتے۔ اسلام سب سے پہلے تو دولت کمانے کے ذرائع پہ پابندی عاید کرتا ہے۔ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز قائم کر کے آمدنی کے ان تمام طریقوں کو روک دیتا ہے جن کے ذریعے ایک آدمی بلا محنت مشقت کئے بے حساب دولت کما سکتا ہے۔ سودی کاروبار جو سرمایہ دارانہ نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے اپنی جملہ اقسام کے ساتھ اسلام میں حرام ہے۔ جوئے سٹے کی ممانعت ہے۔ چوربازاری، ذخیرہ اندوزی، استحصال اور منافع خوری، ناپ تول میں کمی کرنا یہ اور اس قسم کی وہ تمام باتیں اسلام میں ناجائز ہیں جن کے باعث عام لوگ معاشی تنگی میں مبتلا ہوں اور ایک مخصوص طبقہ ان سے فائدہ اُٹھا کر اپنی دولت بڑھائے۔ اس کے بعد اسلام جائز اور حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کے ساتھ بھی ایسی بہت سی قیدیں لگا دیتا ہے کہ معاشی خوشحالی چند آدمیوں کا مقسوم نہ رہے سوسائٹی کے دوسرے طبقات اور افراد کو بھی اس میں

سے باقاعدہ حصہ ملتا رہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کا پورا نظام اسی مقصد کی تکمیل کے لئے قائم کیا ہے۔ جو اغنیاء سے وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اس انتظام کے تحت اسلامی معاشرہ میں ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات فراہم کی جاتی ہیں۔ زکوٰۃ فرض ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی خیرات صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دے کر اسلام اپنے متبعین کو رضا کارانہ خرچ کرنے اور اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق رکھا گیا ہے۔ وفی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ اسلام ارتکاز دولت کے خلاف ہے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دولت چند ہاتھوں میں گردش کرتی رہے اور باقی لوگ اس کے فیض سے محروم رہیں۔ لکیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء۔ اسلام میں تقسیم وراثت کے احکام بھی اسی مصلحت کے تابع ہیں۔

اسلام جبر کا قائل نہیں۔ انسان کو اللہ تعالےٰ نے مختار پیدا کیا ہے اور مختار ہی رہنے دینا چاہتا ہے۔ اسلام جبر کر کے اس کا یہ حق سلب نہیں کرنا چاہتا۔ مذہب تک کے معاملے میں وہ جبر کا روادار نہیں تو کسی کی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو وہ کس طرح جبراً چھین سکتا ہے لیکن زراندوزی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ سونا چاندی جمع کرنے والوں کے لئے سخت وعید ہے۔ الذین یکنزون الذھب والفضۃ فبشرھم بعذاب الیم۔ وہ شخص مسلمان نہیں ہوسکتا جو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سو رہے۔ غلاموں کو اور دیگر متعلقین کو حسبِ مقدرت اچھا کھانا کپڑا مہیّا کرنے کی ہدایت کرتا ہے حبِ مال اور بخل کی مذمت کرتا ہے اور ان تمام باتوں کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ معاشرہ میں انتہا درجہ کی معاشی ناہمواری راہ نہ پائے اور عام خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو۔ اسلام ان اقتصادی اصولوں کی بنیاد پر ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کا کامیاب تجربہ کر چکا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ تجربہ کامیاب نہ ہو۔

اسلام کے اقتصادی نظام کے نفاذ کے بعد سرمایہ داری خود بخود ختم ہو جائے گی اور سرمایہ داری کا خاتمہ اشتراکیت کی طبعی موت ہوگی۔ اشتراکیت سرمایہ داری کا ردِّ عمل ہے۔ سرمایہ داری نہ ہوتی تو آج اشتراکیت کا وجود بھی نہ ہوتا۔ انتہا کا ردِ عمل ہمیشہ انتہا ہوتا ہے۔

ایک انتہا سرمایہ داری ہے تو دوسری انتہا اشتراکیت۔ اشتراکیت انسان کو روٹی کے چند ٹکڑے دے کر اس سے ہر وہ چیز چھین لیتی ہے جو بحیثیتِ انسان اس کا فطری حق اور ما بہ الامتیاز ہے۔ اور سرمایہ داری اسے بے لگام چھوڑ دیتی ہے کہ وہ ابنائے جنس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔ انسان کے معاشی مسئلے کا حل نہ تو سرمایہ داری کے پاس ہے نہ اشتراکیت کے پاس۔ اشتراکیت کے پاس لے دے کر ایک نعرہ معاشی مساوات کا ہے لیکن معاشی مساوات کا وہ تصور جو اشتراکیت پیش کرتی ہے ناقابلِ عمل جبری اور غیر فطری ہے اس لئے معاشرت اور معیشت کے حق میں بحیثیتِ مجموعی اس کے نقصانات زیادہ اور فائدے کم ہیں۔ اشتراکیت جس معاشی مساوات کی تبلیغ کرتی ہے وہ اس عالم کا عنقا ہے۔ خود کمیونسٹ معاشرہ اس کے وجود سے خالی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں معاشی مسائل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ مسائل انتہا درجے کی معاشی ناہمواری نے پیدا کئے ہیں لیکن معاشی مسئلے کو آج کل جتنی اہمیت دی جا رہی ہے اسے دیکھ کر کبھی کبھی یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ انسان انسان نہیں کوئی معاشی حیوان ہے جس کا مقصدِ تخلیق شکم پُری کے سوا کچھ نہیں۔ بے شک پیٹ انسان کے ساتھ ہے۔ مگر انسان پیٹ کا نام نہیں۔ اسلام انسان کے معاشی مسئلے کو نظر انداز نہیں کرتا مگر اتنی اہمیت بھی نہیں دیتا کہ دوسرے مسائل جو زیادہ اہم ہیں نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ آنحضرت صلعم کے پیغام کا ما بہ الامتیاز یہی ہے کہ آپ نے انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کر کے اس کے مسائل کا حل تجویز کیا ہے۔